١٥
اسلام کا
نظامِ محاصل
واقیموا الوزن
بالقسط
ولاتخسروا المیزان

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

پیش لفظ

اسلام کی طویل فکری اور عملی تاریخ میں مسلم اہل علم و دانش کو گوناگوں چیلنجوں اور مبارزتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دور تابعین میں وضع حدیث اور قضاء و قدر کے بارے میں شبہات سے لے کر دور جدید کے مغربی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کے استیلاء تک کا یہ سارا زمانہ ایک مسلسل فکری جہاد اور علمی دفاع سے عبارت ہے۔ اس پورے دور میں اہل علم نے نہ صرف حالات زمانہ کو پیش نظر رکھا، بلکہ ہر نئی فکری مبارزت کے جواب میں اکثر و بیشتر انہی ہتھیاروں اور وسائل سے کام لیا جن سے کام لے کر اسلام پر اعتراضات کیے گئے۔ اس کی کامیاب ترین مثال یونانی علوم وفنون سے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ ابتدائی سو، سوا سو سال کے عبوری دور کے بعد بھی مسلمان مفکرین نے یونانی منطق اور فلسفہ سے اسلامی عقائد کی تفسیر و توضیح کی اور اسلامی تعلیمات کی تبیین و تفہیم کا وہ کام لینا شروع کر دیا تھا جس کے عجیب و غریب نمونے امام غزالی، امام رازی، امام شاطبی اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ کی تحریوں میں ملتے ہیں۔

دورِ جدید میں اس کام کی اہمیت اور پیچیدگی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ پہلے مبارزت صرف ایک میدان میں تھی، یعنی فلسفہ، منطق اور عقلیات کا میدان۔ اب یہ مبارزت زندگی کے ہر میدان میں ہے۔ فلسفہ اور انسانی علوم سے لے کر روزمرہ زندگی کے مظاہر تک، آج ہر قدم پر دنیائے اسلام کو بیرونی اور خارجی قوتوں سے قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ ان میں سے بعض مقامات میں یہ نبرد آزمائی نسبتاً زیادہ اہم اور فوری نوعیت کی ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ ملت مسلمہ ان معاملات کے بارے میں فوری طور پر اپنے کو صف آرا کرے اور اپنے وسائل و اسباب کو کماحقہ استعمال کرے۔ ان اہم اور فوری امور میں ایک انتہائی اہم مسئلہ قانونی، دستوری اور عدالتی معاملات کا ہے۔ اس میدان میں مغربی تصورات و افکار کے تسلط اور غلبہ نے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو متاثر بلکہ ماؤف کر دیا ہے کہ یہ طبقہ اسلام کے تصورات و نظریات کو سمجھنے میں اس طرح مشکل محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی بھی مغربی دانشور۔ تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ دنیائے اسلام میں اس صورت حال کے خلاف ایک شدید ردِعمل اٹھتا نظر آ رہا ہے جو اگر مثبت اور تعمیری خطوط پر آگے بڑھا تو ایک بڑی خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بنے گا۔

اسی ردِعمل کا مظہر وہ دلی آرزو ہے جو اسلام کے تصور عدل و احسان پر مبنی معاشرہ کے قیام اور اسلامی تصورات کے عملی نفاذ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں اٹھتی نظر آتی ہے۔ اسی آرزو کی تکمیل کے انتظار میں آج لاکھوں گردنیں کٹ رہی ہیں، لاکھوں گھر اجڑ رہے ہیں، کتنے ہیں جو گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں اور کروڑوں دل ہیں جو اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی تمنا میں دھڑک رہے ہیں۔ لیکن اس خواب کی تعبیر اس قدر آسان نہیں ہے جتنا ہم میں سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر ایک طویل سفر کی متقاضی ہے۔ ایسا طویل سفر جس کی پہلی منزل، ایک فکری تبدیلی، ایک تعلیمی تحریک اور ایک ذہنی انقلاب سے عبارت ہے۔ جب تک اسلام کے تصورات و تعلیمات پر گہرا ایمان رکھنے والی، دور جدید میں ان کو روبہ عمل لانے کے جذبہ سے سرشار اور اس راہ کی مشکلات سے کلی طور پر آگاہی اور ادراک رکھنے والی

نسل وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک اس خواب کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اس پہلی منزل کا پہلا قدم اسلامی فقہ اور قانون کی کماحقہ تعلیم و تدریس اور اس سلسلہ میں ضروری مردان کار کی تیاری کا کام ہے۔ ایسے مردانِ کار جو اسلامی فقہ کو اس کے بنیادی مآخذ و مصادر سے براہ راست سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں، جن کو رائج الوقت قانونی، دستوری، اور عدالتی تصورات سے گہری لیکن ناقدانہ واقفیت حاصل ہو، جو شریعت کی حقانیت اور صلاحیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور دورِ جدید میں اس کی تعلیمات کو روبہ عمل لانے کا مومنانہ جذبہ رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کی تیاری وقت کی وہ اہم ضرورت ہے جس کو ہماری ملی ترجیحات میں ابھی تک وہ جگہ حاصل نہیں ہوئی جو اس کو ہونی چاہیے تھی۔

بلاشبہ ہمارے بہت سے دینی اداروں اور اسلامی تعلیم کے مراکز میں فقہ کی تدریس و تحقیق کا کام ہو رہا ہے اور فقہی موضوعات پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ سب کچھ قطعاً ناکافی ہے۔ اس تعلیم و تحقیق کا ہمارے قانونی نظام اور دستوری اداروں پر اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ملک میں نفاذِ اسلام کے کام میں پیش رفت نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم کی گئی۔ اکیڈمی نے وکلاء اور ارکان عدلیہ کے تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت اُردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر جدید انداز سے اسلامی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کی اشاعت کے ایک طویل المیعاد منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ تصنیف و تحقیق اور نشر و اشاعت کے اس طویل منصوبہ کے ساتھ ساتھ اکیڈمی نے آج سے چند سال قبل ایک شعبہ ایسا بھی قائم کیا جہاں فاصلاتی تعلیم کے اصولوں کے تحت فقہ اسلامی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ متواضعانہ پیشکش مقبول ہوئی اور اللہ رب العزت نے اپنی بے پایاں نعمت اور لامتناہی فضل سے ہماری اس کاوش کو کامیابی سے نوازا اور ہم تین سال کی مختصر مدت میں اس کورس کے ذریعہ پاکستان اور بیرون ملک پاکستان کے کوئی ڈیڑھ ہزار افراد تک اسلامی قانون اور فقہ کی ایک مربوط اور جامع تصویر پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

زیر نظر کورس وکلاء، طلبہ قانون اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لیے ہے۔ اس کا دورانیہ ایک سال ہے اور یہ چوبیس اسباق یا یونٹوں پر مشتمل ہے جن میں فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ہر سبق میں تدریسی مواد کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لیے کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مطالعہ قانون اسلامی کے اس ابتدائی کورس کے بعد چار دوسرے کورس بھی تیار کرائے جا رہے ہیں جو فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ہمارے ان ''ایڈوانس کورسز'' کی تیاری کا کام جاری ہے اور جلد ہی ہم ان کو بھی شروع کر دیں گے۔

کچھ اس یونٹ کے بارے میں

اسلامی ریاست ہی کیا، دنیا کی کوئی بھی ریاست کسی مضبوط، موثر اور پائیدار مالیاتی نظام کے بغیر نہیں چل سکتی۔ مالیاتی نظام کی تشکیل کے لیے ذرائع آمدنی اور محصولات ناگزیر ہیں۔ یہ ذرائع آمدن اور محصولات ریاست کی ضروریات کے علاوہ ریاست کے مقاصد اور نظریے کے ساتھ بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ خاص طور پر ایک نظریاتی ریاست کے ذرائع آمدن اور محصولات لازماً وہی ہوں گے جو اس کے تصور حیات کے عین مطابق ہوں۔ مثلاً اسلامی ریاست میں بعض ایسے ممنوعات کا تصور ملتا ہے جو کسی غیر اسلامی نظام میں کاروبار حیات کا لازمہ تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ ممنوعات محض نظری اعتبار سے ممنوع نہیں ہیں بلکہ عملاً بھی ان کا اسلامی نظام مالیات میں کوئی کردار ہی نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف وہی ممنوعات لادینی ریاستوں میں ریاست کی آمدن اور باشندگان مملکت کے روزگار کا بڑا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اسلامی ریاست آمدنی کے ان بڑے بڑے وسائل سے نہ صرف خود محروم رہتی ہے بلکہ باشندگان مملکت کو بھی ان سے محروم کر کے بظاہر روزگار کے مواقع محدود کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادا جواب تو یہی ہے کہ اسلام کا الگ سے اپنا ایک مالیاتی نظام ہے جو اس کی نظریاتی اور اخلاقی بنیادوں پر استوار ہے۔ یہ نظام جہاں آمدن کے لیے بعض دوسرے وسائل تلاش کرتا ہے وہاں روزگار کے لیے کئی دوسرے مواقع بھی پیدا کرتا ہے۔

ان امور کے مطالعہ کے لیے اسلامی قانون خط و کتابت کورس کا پندرہواں یونٹ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس یونٹ میں آپ اسلامی ریاست کے ذرائع آمدن کے بارہ میں ابتدائی باتیں پڑھیں گے۔ آغاز میں اسلامی ریاست کے ذرائع آمدن اور جدید دور کی اصطلاح ''ٹیکس'' کا ایک مختصر موازنہ کیا گیا ہے۔ بحث کا آغاز دورِنبوت سے کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اسلامی ریاست کے ذرائع آمدن کیا تھے۔ اس کے بعد وسائل آمدن کی پانچ بڑی اقسام ہیں۔ درجہ بندی کر کے ان کی ذیلی قسموں کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس بیان میں آپ یہ محسوس کریں گے کہ اسلامی نظام مالیات، مال کو محض مال کے طور پر نہیں لیتا بلکہ اولاً اسے دو بنیادی قسموں حلال و حرام میں تقسیم کر کے تمام مالیاتی نظم و ضبط حلال کی بنیاد پر قائم کرتا ہے۔ اس نظام میں ناجائز ذرائع سے ملنے والی حرام شئے اکثر و بیشتر مال کی فنی تعریف پر بھی پورا نہیں اترتی۔ حرام آمدنی نہ کسی راسخ العقیدہ مسلمان کا مطمح نظر رہی ہے اور نہ اسلامی ریاست کی آمدنی میں اس کا کوئی حصہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مال کو حلال و حرام کے دو زمروں میں تقسیم کر کے مزید احتیاط کے طور پر غیر مسلم باشندگان مملکت سے حاصل ہونے والے محصولات کا حساب الگ رکھا جاتا ہے اور ان کے خرچ کی مدات بھی الگ الگ رکھی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ٹیکس کے بارہ میں ایک مختصر لیکن جامع گفتگو بھی کی گئی ہے۔ یونٹ کے آخر میں حسب قاعدہ مزید مطالعہ کے لیے بعض مفید کتب کی نشاندہی کی گئی ہے۔

حکومتی محصولات، مصارف اور مالیات سے متعلقہ موضوعات کا بڑی حد تک تعلق اسلام کے سیاسی نظام سے ہے اس لیے ان موضوعات پر مطلوبہ بحثیں بالعموم کتب فقہ کی عام کتب میں کم ملتی ہیں۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر فقہائے اسلام نے روز اوّل ہی سے اس کو اپنی خصوصی تحقیقات کا موضوع بنایا۔ اس سلسلہ کی ابتدائی کتب میں سے امام

ابو یوسفؒ کی "کتاب الخراج" بہت نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اصل میں یہ ایک دستاویز یا یادداشت ہے جو امام صاحب نے خلیفہ وقت کے بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے تیار کی۔ اس دستاویز میں رموز مملکت کے اقتصادی اور معاشی امور پر فقہ اسلامی کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ بعد میں ابو عبید کی "کتاب الاموال" اور ماوردی کی "الاحکام السلطانیۃ" میں بھی بعض نئی اور مفید بحثیں سامنے آئیں۔

عہد حاضر میں عالم اسلام کے کم و بیش تمام ممالک کا مالیاتی نظام انہی خطوط پر استوار ہے جن پر مغربی نو آبادیاتی طاقتوں نے قائم کیا تھا۔ اعداد و شمار سے بھرپور سالانہ میزانیہ میں غیر اسلامی باتیں بظاہر کم ملیں گی لیکن اسلامی تعلیمات و تصورات کے نقطہ نظر سے ان دستاویزات میں شاید ہی کوئی حوصلہ افزا بات ملتی ہو۔ جب سارے کا سارا ریاستی نظم ونسق غیر اسلامی تصورات پر قائم ہو اور اس میں تبدیلی کی مثبت، مخلصانہ اور واقعی کوششیں کم ہی کی گئی ہوں تو نتائج کی توقع فضول ہے۔ ان حالات میں اہل دانش کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ جہاں جہاں ممکن ہو، وہاں اس نظام باطل کی کمزوریوں کو دلائل کی قوت سے ثابت کریں اور اس کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ عام تاثر یہ ہے کہ ایسی کوئی کوشش سیاسی تصورات اور نظام میں تبدیلی ہی کے ذریعے کامیاب ہوسکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تاثر بڑی حد تک ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ تبدیلی کی ان کوششوں کی کامیابی کا بڑی حد تک انحصار ذہنی رویوں اور انداز فکر میں تبدیلی پر ہے۔ زیرِنظر یونٹ میں یہی ذہنی تبدیلی پیدا کرنے کی ایک حقیر سی کوشش کی گئی ہے۔ اگر اس متواضعانہ کاوش کے ذریعے کسی ذہن میں ہلکا سا تموج بھی پیدا ہوا تو شریعہ اکیڈمی اسے اللہ کے احسان سے تعبیر کرے گی۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ اس بارے میں ہمیں اپنی آراء اور مشوروں سے نوازیں تاکہ ہم اپنے ان منصوبوں میں آئندہ مزید بہتری پیدا کرسکیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی
ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۵- جمادی الاخر ۱۴۱۸ھ
۸- اکتوبر ۱۹۹۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کا نظامِ محاصل

تمہید

جدید علم سیاسیات میں جس ادارے کو ریاست کے نام سے موسوم کیا گیا ہے وہ کسی نظام یا بندوبست کے ذریعے ہی چلایا جا سکتا ہے۔ نظام اور بندوبست چلانے کے لیے لازمی ہے کہ اس میں انسانی محنت اور عقل و شعور کے ساتھ مادی وسائل اور بالخصوص مال و دولت اور سرمائے کا وجود بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر ریاست اپنے شہریوں کو بہترین نظام مہیا کرنے کی غرض سے مختلف ذرائع سے سرمایہ حاصل کرتی ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر ریاست اپنے حالات کے مطابق مختلف اقدام کرتی ہے۔ اگر کسی ملک میں معدنی وسائل کی کثرت ہو تو ایسی ریاست کے بیشتر معاشی مسائل آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ کوئی ملک صنعت و حرفت کے ذریعے اپنے لیے وسائل جمع کرتا ہے۔ کہیں زراعت پر مبنی معاشرہ ہو تو اس ملک کے وسائل آمدنی جداگانہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔

سرمایے کے حصول کے لیے ریاستیں ٹیکس بھی عائد کرتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے جمع شدہ سرمایے کے ذریعے ان مقاصد کو حاصل کیا جائے جن کے لیے ریاست وجود میں آتی ہے، اور ریاست کی بقاء اور تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ دنیا کے حاصل مختلف ممالک کے باشندوں پر لگائے جانے والے ٹیکسوں کی نوعیت عموماً ان کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہ بات نظریاتی مقاصد کے لیے قائم ہونے والی ریاستوں میں بطور خاص دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ ممالک جو خود کو فلاحی ریاست قرار دیتے ہیں، ان کے ہاں ٹیکسوں کا نظام اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ باشندگان مملکت پر وہی ٹیکس لگائے جائیں جو ان کے حقوق کو متاثر نہ کریں، اور حاصل ہونے والی رقوم آبادی کی اجتماعی فلاح پر خرچ کی جائیں۔ جنگی جنون میں مبتلا قومیں اپنے ہاں ٹیکسوں کا نظام یوں وضع کرتی ہیں کہ ان کی آبادی کو ہر دم اپنے عدم تحفظ کا احساس رہے تا کہ وہ بخوشی ٹیکس دینے پر راغب ہوں۔ دنیا کی فرماں روائی کے زعم میں مبتلا اقوام کے اربابِ حل و عقد ٹیکسوں کے نظام میں اس طرح وسعت پیدا کرتے ہیں کہ آبادی کے بہت بڑے حصے کو اس کے ادا کرنے میں کوئی تردد محسوس نہیں ہوتا۔ یہ صورت حال اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک اس ریاست کی آبادی بچشم خود اپنے ملک کے مالیاتی نظام کو انہی مقاصد کے لیے وقف دیکھتی ہے جن کے لیے وہ مالی بوجھ برداشت کر رہی ہوتی ہیں۔ جونہی یہ احساس عام ہونا شروع ہوتا ہے کہ ٹیکسوں کے امین ٹیکس گزاروں کی دولت کو طے شدہ فارمولے کے مطابق خرچ کرنے کے بجائے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد، نفس پرستی اور تنعم میں ضائع کر رہے ہیں، تو اس وقت مالیاتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ دینے والے اپنی رقموں کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور لینے اور خرچ کرنے

والے ٹیکس گزاروں سے حاصل کی ہوئی امانت کو بے رحمی سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ طرزِعمل، جو افراد کی سوچ سے شروع ہوتا ہے، بالآخر ضعف ریاست پر منتج ہوتا ہے[1]۔ اس اصول سے اسلامی ریاست بھی مستثنٰی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ٹیکسوں کا نظام، ذرائع آمدنی اور مالیاتی وسائل کی فراہمی اور ان کے استعمال سے متعلق شریعت مطہرہ نے بنیادی ہدایات دی ہیں۔ ان ہدایات میں توازن و ہم آہنگی کا ایسا موقع ملتا ہے جو کسی دوسرے نظام میں ہمیں نظر نہیں آتا۔

بعض لوگوں کے ذہنوں میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں ٹیکس کیوں؟ جب کہ زکوٰۃ، صدقات نافلہ، عشر، معدنی وسائل، مال غنیمت میں ریاست کا ایک نسبتی حصہ موجود ہوتا ہے اور سرکاری زمینوں اور باغات سے ریاست کی آمدنی، جزیہ، خراج اور فئے جیسے ذرائع آمدنی ریاست کے پاس موجود ہیں۔

یہ سوال لاعلمی پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ مذکورہ بالا مدات آمدنی میں سے ہر ایک مد کسی اسلامی ریاست کے پاس لازماً موجود ہو۔ جزیہ مفتوحہ علاقے میں بسنے والی غیر مسلم آبادی پر چند شرائط کے ساتھ عائد ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسی آبادی کا وجود ہو یا جزیہ کے حصول کی شرائط پوری ہوتی ہوں۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ کسی ریاست کے پاس معدنی وسائل واقعی موجود ہوں۔ لازمی نہیں کہ تسلسل کے ساتھ جہاد ہوتا رہے جس سے مال غنیمت اور فئے جیسے ذرائع آمدنی حاصل ہوتے ہیں بلکہ یہ سب وہ مدیں ہیں جن سے مستقل آمدنی کا حصول یقینی نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ ریاست کا بطور ٹیکس ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مسلمان باشندوں کی ایک مالی عبادت ہے جس کے خرچ کے لیے کچھ مدات مقرر اور طے شدہ ہیں۔ ان سے ہٹ کر زکوٰۃ کی آمدنی خرچ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس عبادت میں خلل اندازی واقع ہو رہی ہے۔ زکوٰۃ کے مصارف طے شدہ ہیں جب کہ حکومت کی ضروریات اور مصارف کا دائرہ پھیلتا اور سکڑتا رہتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کسی وقت اسلامی ریاست کے ذرائع آمدنی میں مذکورہ بالا ذرائع شامل ہو جائیں اور اس کے باوجود بعض حالات کے تحت اس کے اخراجات پورے نہ ہوں تو ریاست ٹیکس عائد کرنے کا حق رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر خشک سالی، زلزلے اور قحط وغیرہ کی صورت میں ضروری خدمات حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو صارفین سے ٹیکس کے نام پر رقوم اکٹھی کی جاتی ہیں۔

بدقسمتی سے ٹیکس کو کچھ لوگوں نے سزا کا ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ فرض کیجئے محلّہ کی ایک گلی کے تمام گھرانے یہ طے کرتے ہیں کہ گلیوں اور نالیوں میں روزانہ صفائی کے لیے ایک شخص دو گھنٹے کے لیے ملازم رکھا جائے گا۔ جس کی اجرت سب مل کر ادا کریں گے۔ اجرت کا جو حصہ ایک فرد ادا کرتا ہے اس کا نام صفائی ٹیکس رکھ لیجئے، یا باری باری

تمام گھر گلی کی صفائی کریں، یا یہ معاملہ کسی بلدیاتی ادارے کو تفویض کر دیا جائے، بات ایک ہی ہے اور یہی ٹیکس کی حقیقت ہے۔ اب بلدیاتی ادارے ٹیکس تو لے لیتے ہیں لیکن اپنے فرائض میں غفلت برتتے ہیں۔ اسی طرح گاڑیوں کے مالکان جو ٹیکس ادا کرتے ہیں اس کے بدلے میں ان کو توقع ہوتی ہے کہ سڑکیں درست حالت میں رہیں گی۔ مگر عملاً ایسے نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ٹیکس ادا کرنا رضاکارانہ سے زیادہ جبری بن گیا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات چلانے کے لیے ابتدا میں جو رقم درکار ہوتی ہے اسے قومی خزانے سے حاصل کیا جاتا ہے اور قومی خزانہ تمام آبادی کی مشترک ملکیت ہوتا ہے لیکن نشریات آبادی کے صرف اس حصے کے لیے ہوتی ہیں جو ٹی وی کی نشریات میں دلچسپی لے اور ٹی وی خریدنے کے لیے استطاعت بھی رکھتا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ قومی خزانے کی رقم صرف ان لوگوں پر کیوں خرچ ہو جو ٹیلی ویژن رکھ سکتے ہیں؟ دوسرے نادار لوگ کیوں اس سے محروم رہیں؟ اس مشکل کے حل کے لیے ٹیلی ویژن رکھنے والوں پر ایک ٹیکس لگایا جاتا ہے جو نشریات کے اخراجات پورے کرنے کے لیے معاون ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست میں ٹیکسوں کا نظام اس طرح ترتیب پاتا ہے کہ اس کے اندر اسلامی تعلیمات کا عکس باسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

اسلامی ریاست میں ٹیکس کی حقیقت

یہ فرض کرتے ہوئے کہ کسی اسلامی ریاست کے پاس وہ تمام ذرائع آمدنی نہیں ہیں جو عام طور پر معروف ہیں بلکہ ان میں کچھ ہیں یا بالکل نہیں ہیں، جب ہم اسلامی ریاست میں عائد کردہ ٹیکسوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد محض بیت المال میں دولت کی فراوانی پیدا کرنا نہیں ہے اور نہ ان کے ذریعے محض فلاحی مملکت کا قیام ہے بلکہ فلاحی مملکت اسلامی ریاست کا ایک جزو ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی فلاحی مملکت خود بخود وجود میں آ جاتی ہے، الگ سے اس کے کوئی لوازم نہیں ہیں۔

ٹیکس ریاست کی ایک ضرورت ہے جو چند ضابطوں کے اندر رہ کر حاصل کیے جاتے ہیں۔ ٹیکسوں کا نفاذ شریعت کا کوئی بنیادی مطالبہ نہیں ہے اور نہ اس کے لیے صراحت کے ساتھ احکام دیئے گئے ہیں جن سے مقررہ مالی مطالبات کے علاوہ کسی دیگر مطالبہ کا لازمی ہونا ظاہر ہو۔ ٹیکس تو دراصل ان حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں جن کے تحت ان کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ جونہی وہ حالات ختم ہوتے ہیں، ٹیکس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ضرورت پیش آنے پر لازمی نہیں ہے کہ ٹیکس ہی کے ذریعے سرمایہ اکٹھا کیا جائے بلکہ اگر دوسرے ذرائع جیسے ترغیب وغیرہ سے وسائل اکٹھے ہوسکیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ مستحسن ہے جس کا اجر نیکی کی صورت میں ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جہاد کے لیے جب اسلحہ اور دوسرے وسائل کی ضرورت پڑتی تھی تو آپ اس کے لیے اعلان

کرتے تھے۔ لوگ اپنی مرضی سے بسا اوقات اپنے سارے جمع شدہ اموال و اسباب لے آتے اور جس کے پاس کچھ نہ ہوتا وہ دن بھر محنت کر کے اس کے بدلے میں کھجوروں کی ٹوکری ہی اٹھا کر لے آتا کہ اسے رسول اللہ کی خدمت میں پیش کر سکے۔ حالانکہ جنگی مقاصد کے لیے مال کا حصول ایک دوسرے ذریعے سے بھی ممکن تھا کہ آبادی کے ہر فرد یا کنبہ پر ایک خاص شرح سے جہاد ٹیکس عائد کر دیا جاتا لیکن ایسے نہیں کیا گیا۔ بلکہ ترغیب کے ذریعے اس مقصد کو پورا کیا جاتا رہا جو زیادہ موثر بھی ہے اور بے ضرر بھی۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مقاصد شریعت[۲] کے حصول کے لیے اسلامی ریاست مالی وسائل اکٹھے کرنے کے لیے کوئی بھی جائز اور مناسب ذریعہ اختیار کر سکتی ہے۔ مملکت کے اخراجات جائز حدود کے اندر رہ کر اعتدال کے ساتھ ترتیب دیئے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر ضروری ٹیکس عائد کیے جائیں۔ سرکاری اراضی اور دوسرے اثاثوں سے ہونے والی آمدنی سے مملکت کا نظام چل سکتا ہو تو بھی غیر ضروری ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوسری طرف مملکت کے جملہ معاملات بغیر ٹیکس عائد کیے چل رہے ہوں اور کسی اضافی ٹیکس کی ضرورت نہ ہو لیکن دیکھا یہ جا رہا ہو کہ رعایا تعیشات کی طرف مائل ہے اور اندیشہ ہے کہ بعد میں اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے تو اس رجحان کو کم کرنے کے لیے اشیائے تعیشات پر ٹیکس عائد کیے جا سکتے ہیں۔ ٹیکسوں کے معاملہ میں اصل الاصول مقاصد شریعت کا حصول ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک اور خلافت راشدہ سے لے کر بعد کی مسلمان حکومتوں میں بھی ایک چیز ہر جگہ ملتی ہے۔ وہ یہ کہ حکمران کلی طور پر اسلامی نہ سہی، بڑی حد تک اسلامی رویے پر کاربند ہوتے تھے۔ اسی لیے بعد کے تمام ادوار میں بھی عدالتی کارروائی اسلامی عدل و انصاف کے زریں اصول پر ہوتی تھی۔ حق داروں کا حق انہیں وقت پر ملتا تھا۔ تعلیمی، معاشی اور عائلی معاملات مکمل طور پر مفتیان کرام کے فتاویٰ کی روشنی میں چلائے جاتے تھے۔ منکرات کے انسداد اور معروف کے اہتمام کا بطور خاص ایک باقاعدہ نظام قائم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی میں آنے والے تغیرات کا سامنا ہمیشہ قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے کیا گیا ہے۔ ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ یہ مسلمان حکومتیں اور حکمران اس بات کا التزام بھی کرتے تھے کہ مملکت کے وسائل آمدنی کا بڑا حصہ کچھ خاص مدوں ہی سے حاصل کیا جائے۔ یہ مخصوص مدیں قرآن و سنت میں کہیں واضح اور کہیں اشارتاً ذکر کی گئیں ہیں۔ ان ذرائع آمدنی کے تصورات قرآن و سنت سے ماخوذ تھے اس لیے لازمی تھا کہ ان کے خرچ کی تفصیل بھی وہی ہو جو قرآن و سنت میں ملتی ہے۔

یہ وضاحت پیش کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ماضی کی خود مختار اسلامی حکومتوں کا موازنہ موجودہ دور کے مسلمان ممالک سے کرنا اور ان پر وہی حکم لگانا درست نہیں ہے۔ موجودہ دور کے مسلم ممالک کی بڑی تعداد

میں استعماری طاقتوں کے اثرات وہاں کے تعلیمی اور قانونی ڈھانچے پر اتنی قوت اور طاقت کے ساتھ موجود ہیں کہ اجتماعی زندگی میں کسی مسلمان ملک کے حکمران یا باشندے مکمل اسلامی معاشرے کا موجودہ حالات میں صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔

اس باب میں اسلام کے نظام محاصل، مختلف زمانوں میں اس کی تشکیل اور ان سے متعلقہ موضوعات کا تعارف کرایا جائے گا۔ موجودہ دور میں مسلمان ممالک کے ذرائع آمدنی تبدیل ہو چکے ہیں۔ تعلقات بین الاقوام میں وسعت پذیری کے باعث کئی ممالک کے ذرائع آمدنی گزشتہ ادوار کے ممالک کے وسائل سے یکسر مختلف ہیں۔ اس کے باوجود قرآن و سنت میں مذکور اصول آج بھی نظم معیشت کے لیے راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

دورِ نبوت میں بیت المال کے وسائل آمدنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ریاست کی آمدنی کے ذرائع مختصر تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاستی ڈھانچہ بھی ابتدائی حالت میں ہونے کی وجہ سے بہت مختصر تھا۔ اس زمانے میں بیت المال کے اخراجات جن ذرائع سے پورے کیے جاتے تھے وہ یہ تھے:

ا۔ فے

لغوی اعتبار سے فئے سے مراد لوٹانا یا رجوع کرنا ہے۔ اس کے معانی میں کسی شئے کی واپسی کے بارے میں بیان لازماً ملتا ہے[۳]۔ دراصل زمین میں پائے جانے والے جملہ اموال اللہ کی ملکیت ہیں جن میں اسلامی ریاست اس کے نائب کے طور پر تصرفات کی مختار ہے اور وہ اموال جو کفار یا ان کی حکومتوں کے پاس ہوں غصب شدہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بغیر جنگ کیے کفار اپنے اموال اسلامی لشکر کو دے دیں تو اسے فئے کہتے ہیں۔ گویا انہوں نے مال اصل مالک کو لوٹا دیا ہے، اسی لغوی رعایت سے اسے فئے کہتے ہیں۔ اصطلاح میں یہ کفار کا وہ مال ہے جو بغیر جنگ کیے اسلامی لشکر کے ہاتھ آئے۔ قرآن کریم میں ہے:

> وَمَا اَفَآءَاللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ (حشر، ۵۹:۶)
>
> اور جو مال اللہ نے ان (کفار) کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے، وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں۔

یہ بنونضیر کے اموال کا ذکر ہے جنہوں نے محاصرے کے بعد اپنی آبادیاں خالی کر کے ملک بدر ہونا قبول کر لیا تھا۔ ان کے اموال فے کہلائے۔ بعد میں فقہاء نے فے کی تعریف میں ان تمام اموال کو داخل کر دیا جو غیر مسلموں سے بغیر لڑے حاصل کیے جائیں[۴]۔ ان میں خراج، جزیہ، غیر مسلموں کے لاوارث ترکہ جات، مرتدوں کے اثاثے، جنگی

تاوان اور غیر مسلم تاجروں سے تجارتی محصول (عشور) شامل ہیں۔

۲۔ مالِ غنیمت

یہ بھی بیت المال کے وسائل آمدنی میں سے ایک ہے۔ کافر لشکر سے لڑائی کے نتیجے میں جو کچھ مسلمانوں کے ہاتھ آئے اسے مالِ غنیمت کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں آتا ہے:

واعْلَمُوٓا اَنَّما غَنِمْتُمْ مِّنْ شیءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَه' وللرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی والْمسٰکِیْنِ وابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ (انفال، ۸:۴۱)

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر۔

دوسری آیات اور احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار سے لڑائی کے بعد ان کا جو مال اسلامی لشکر کو ملے اس کے پانچ حصے کر کے چار حصے لڑائی میں شریک مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں، پانچواں حصہ بیت المال کو دیا جائے جس کے خرچ کی تفصیل مذکورہ بالا آیات میں بیان کی گئی ہے۔

مال غنیمت کے بارے میں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پانچواں حصہ بیت المال کا ایک ذریعہ آمدنی تو ہے لیکن اس کے مصارف وہی ہیں جو آیت میں مذکور ہیں، ان سے ہٹ کر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ جزیہ

آمدنی کے مذکورہ بالا دونوں ذرائع ہنگامی تھے۔ ضروری نہیں کہ مملکت اسلامی ہر سال جنگ کو اپنے لیے لازمی ٹھرائے تا کہ فے یا مال غنیمت کی شکل میں حاصل ہونے والے مال سے اس کا سالانہ میزانیہ **(Budget)** چل سکے۔ لیکن اگر جزیہ حاصل ہو تو بعض حالات میں یہ مستقل ذریعہ آمدنی ہو سکتا ہے۔ جزیہ وہ محصول ہے جو اسلامی ریاست بزور شمشیر فتح ہونے والے علاقوں میں رہنے والے ان غیر مسلموں پر عائد کرتی ہے جو نہ اسلام قبول کریں اور نہ اسلامی ریاست کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے خود کو پیش کریں۔ مفتوحہ علاقوں کے غیر مسلم باشندوں کے لیے تین راستے ہیں، ان کی مرضی ہے جو بھی اختیار کر لیں۔

(۱) اسلام قبول کر لیں

(۲) فوج میں شامل ہو کر وطن کے دفاع میں حصہ لیں۔

(۳) ایک خاص رقم بطور ٹیکس دیں جو ان کی حفاظت پر خرچ کی جائے۔

جزیہ کو بعض لوگ غیر مسلم رعایا پر ایک جبری ٹیکس قرار دیتے ہیں، حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ ریاست

کا ہر مسلمان جنگی خدمات کے لیے پابند ہے۔ اس مقصد کے لیے مملکت اخلاقی طور پر بھی مسلمان باشندگان کو تیار کرتی ہے اور قانون اعتبار سے بھی وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ بغیر کسی عذر شرعی کے اس سے انکار کرنے والے گناہ گار ہی نہیں، مجرم بھی ہیں، کیونکہ مسلمان ہونے کے حوالے سے اسلامی ریاست کی حفاظت ان کا فرض اولین ہے۔ یہ قید غیر مسلموں کے لیے نہیں ہے کیونکہ جس ریاست کی مبادیات کے وہ سرے ہی سے منکر ہیں اس میں وہ زندگی تو گزار سکتے ہیں، اس کی حفاظت کرنے کے مکلّف نہیں، جب کہ آبادی کا ایک حصہ ہونے کی بناء پر ان کی حفاظت اسلامی ریاست کے ذمہ ہے۔ البتہ وہ خود وطن اور زمین سے محبت کی نسبت سے اسلامی ریاست کی جانب سے بخوشی جنگ میں شریک ہوں تو ان پر جزیہ واجب نہیں۔

بنظر غائر دیکھا جائے تو جزیہ غیر مسلموں کے لیے ایک سہولت ہے جو غیر مسلموں ہی کو حاصل ہے۔ مسلمان آبادی کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنی جان کی بازی لگائے۔ غیر مسلم آبادی کے لیے تو یہ نفع ہی کا سودا ہے کہ ان پر معمولی رقم بطور ٹیکس عائد کی جائے اور یوں وہ اپنی حفاظت سے بے نیاز ہو جائیں۔ ایسی غیر مسلم آبادی کو ذمی یا اہل ذمہ کہتے ہیں۔ جزیہ کے بارے میں قرآن حکیم کا حکم ان الفاظ میں ہے:

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لاَ یُؤمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلاَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلاَ یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلاَ یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ، ۹:۲۹)۔

جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

جزیہ تمام غیر مسلم آبادی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے واجب ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے شہری ریاست کے بنیادی نظریہ کے دفاع میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری صرف عاقل، بالغ اور تندرست مسلمان مردوں ہی پر عائد ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم باشندوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی جان و مال کی قربانی دیں، مناسب نہیں ہے۔ لہذا ان کا فرض ہے کہ ریاست کے فراہم کردہ تحفظ کے عوض ایک ٹیکس ادا کریں۔ اسلامی ریاست غیر مسلم رعایا کے لیے مزید رعایت یہ کرتی ہے کہ خصوصی ٹیکس صرف خوش حال غیر مسلموں پر عائد ہوتا ہے۔ تنگ دست، نادار اور غریب لوگوں سے اس کی وصولی نہیں ہوتی۔

۴۔ خراج

یہ بیت المال کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے جو زمین کی پیداوار سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں مسلمان آبادی کی اپنی زمینوں کی پیداوار شامل نہیں ہے۔ ایسی زمین اگر خراجی پانی سے سیراب ہو رہی ہو تو اس پر خراج عائد ہوسکتا ہے۔
خراج اس زمین کی پیداوار سے حاصل ہوتا ہے جو اسلامی لشکر کی مفتوحہ ہو۔ چاہے اس کے غیر مسلم مالکان خراج کے معاملہ پر مسلمانوں سے صلح کریں، چاہے جنگ کے بعد فتح حاصل ہونے پر مفتوحہ زمین ذمیوں کو بغرض کاشت دے کر اس سے لگان حاصل کیا جائے۔ اس طرح پانی کا کوئی بند، ذخیرہ، تالاب، ندی، نہر، کنواں یا کوئی چشمہ بھی خراجی پانی کی تعریف میں آسکتا ہے۔ ایسے پانی سے سیراب ہونے والی ہر زمین سے خراج وصول ہوتا ہے، چاہے اسے مسلمان کاشت کرتے ہوں۔ خراج کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (حشر، ۵۹:۷)

جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تا کہ وہ (مال) تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

خراج فئے کی ایک شکل ہے جس کے اخراجات آیت میں مذکورہ ضروریات ہی کے لیے ہیں۔ حدیث سے خراج کی مشروعیت بایں طور پر ثابت ہوتی ہے۔
حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں سے وہاں کی زمین کی آدھی پیداوار کے عوض، خواہ وہ کھیت (کا غلہ) ہو یا درختوں کے پھل، معاملہ کیا تھا[۵]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں خراج کی جو شکل زیادہ رائج تھی اسے خراج بالمساحت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، یعنی اخراج کا وہ طریقہ جس میں کھیت کے رقبے کے اعتبار سے کاشت کار سے پیداوار وصول کی جاتی تھی۔ بعد کے ادوار میں جو طریقہ زیادہ مقبول ہوا وہ پیداوار کی مقدار کے لحاظ سے وصول یابی کا تھا۔ جیسے کل پیداوار کا ایک تہائی یا چوتھائی، خراج کی اس قسم کو خراج بالمقاسمہ کہا جاتا ہے۔

۵۔ زکوٰۃ

آمدنی کا یہ ذریعہ سب سے اہم ہے۔ مالی اعتبار سے بظاہر یہ ٹیکس کی طرح ہے لیکن اسلامی تعلیمات میں اسے عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ قرآن کریم میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں نماز قائم کرنے کے ساتھ زکوٰۃ ادا

کرنے کا حکم دیا گیا، زکوٰۃ کا ذکر جس انداز میں کیا گیا اس سے بالوضاحت معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اجتماعی اور ریاستی فریضہ ہے جس کو مربوط انداز میں چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی ادارہ درکار ہے۔ لیکن جہاں مسلمانوں کا حکومتی ادارہ موجود نہ ہو وہاں انفرادی طور پر مسلمان خود یہ عبادت ادا کرنے کے مکلف ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (حج، ۲۲:۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔

فرضیت زکوٰۃ اور اس کی اہمیت کسی بھی مسلمان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ احادیث کی کتاب الایمان اور کتاب الزکوٰۃ کے عنوانات کے تحت اس بارے میں احکام ملتے ہیں جن میں سے صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا، ''جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اس کا مال گنجے سانپ کی شکل میں اس کے پاس لایا جائے گا جس کے سر پر دو سیاہ نشان ہوں گے۔ یہ (سانپ) اس (مالدار) کے گلے میں ڈالا جائے گا جو اس کے جبڑوں کو ڈسے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال! میں ہوں تیرا خزانہ! پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی یہ آیت پڑھی:

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًالَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّلَّھُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَابَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (آل عمران، ۳:۱۸۰)

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا[۶]۔

زکوٰۃ کے معاملہ میں یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ عبادت ہونے کی وجہ سے یہ انفرادی فعل ہے اس لیے جس کا جی چاہے ادا کرے اور جس کا جی چاہے عذر تراشی کو وطیرہ بنائے، بلکہ یہ عبادت ہے جسے پابندی سے ادا کرانا حاکم کے ذمہ ہے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں یہاں تک وہ گواہی دینے لگیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ چنانچہ (اگر وہ ایسا کریں تو) مجھ سے ان کے جان و مال محفوظ ہو جائیں گے، ماسوا اس سزا کے جو اسلام نے کسی دوسرے جرم میں ان کے لیے مقرر کی ہو[۷]۔

فرضیت زکوٰۃ اور اس کی اہمیت کسی بھی مسلمان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کُتب احادیث میں کتاب الایمان اور کتاب الزکوٰۃ میں جگہ جگہ اس بارے میں مفصل احکام ملتے ہیں۔ مدینہ میں جب مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اپنے روزمرہ امور احکام الٰہی کے تابع رہ کر چلانے کا موقع ملا تو دوسرے احوال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ انہوں نے زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام بھی فرمایا۔

زکوٰۃ عبادت ہے اور عبادت صرف عاقل اور بالغ مسلمان پر واجب ہے، اس لیے زکوٰۃ آبادی کے صرف اس مسلم حصہ پر فرض ہے جو عاقل اور بالغ ہو، بچوں پر زکوٰۃ بالکل نہیں ہے، چاہے ان کے پاس بے شمار مال کیوں نہ ہو[۸]۔

زکوٰۃ اس مال سے وصول کی جاتی ہے جسے اپنے مالک کے قبضے میں ایک سال گزر گیا ہو۔ جو اشیاء انسان کے اپنے اور اس کے کنبے کے تصرف میں ہوں، ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، جیسے رہنے کے لیے گھر، گھر کے اندر روزمرہ استعمال کی اشیاء، سواری اور سونے چاندی کے زیورات کی ایک خاص مقدار یا سونا چاندی وغیرہ۔ یہ سب زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ مال کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے الگ الگ احکام ہیں۔ یہ دو اقسام مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) اموال باطنہ

مال کی اس قسم میں وہ اشیاء آتی ہیں جنہیں پوشیدہ رکھنا ممکن ہو۔ مثلاً سونا، چاندی، نقد روپیہ اور گوداموں میں رکھا ہوا مال تجارت وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج الوقت اوزان آج کل کے پیمانوں سے مختلف تھے، اس زمانے میں مثقال اور اوقیہ مروج تھے۔ سونا اس زمانے میں دینار میں استعمال ہوتا تھا اور چاندی درہم کے لیے۔ موجودہ دور میں یہ سب کچھ یکسر تبدیل ہوگیا، اس لیے ماہرین نے آج کل کے اوزان کے مطابق یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ساڑھے سات تولہ سونے سے کم مقدار یا اس مالیت کی نقدی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ چاندی کے لیے یہ مقدار ساڑھے باون تولے ہے۔ ان مقداروں سے بڑھ جانے پر سونے چاندی پر زکوٰۃ ادا کرنا لازمی ہے۔ اتنی ہی مالیت کی نقد رقوم زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے زیادہ پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ اموال باطنہ پر زکوٰۃ ادا کرنا خود افراد کے ذمہ ہے۔ سرکاری حکام جبراً وصول کے مجاز نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے بارے میں مکمل تفصیل خود مال کے مالک کو معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کسی نے دوسروں کی امانت اپنے پاس رکھی ہو یا مکمل سال نہ گزرا ہو، علی ہذاالقیاس۔

(ب) اموال ظاہرہ

اموال ظاہرہ سے مراد وہ مال ہے جو ظاہر ہو اور جس کے بارے میں دوسرے لوگوں اور حکام کو علم ہو۔ اس

کی تفصیل چاہے کچھ بھی ہو، اور موجودہ دور میں اس کی فہرست میں اضافہ بھی ممکن ہے، لیکن مختصراً یہ وہی مال ہے جو پوشیدہ نہ رہ سکے۔ مال کی اس قسم میں اوّلاً زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ ہے جسے عشر کہتے ہیں۔ جس زمین کی پیداوار قدرتی ذریعہ آبپاشی استعمال کرنے سے حاصل ہوتی ہو اس کی کل پیداوار کا دس فیصد زکوٰۃ (عشر) ادا کرنا لازمی ہے اور جس زمین کے ذریعہ آبپاشی میں کاشتکار کی محنت بھی شامل ہو اس کی کل پیداوار کا پانچ فی صد یعنی (نصف عشر) دینا لازمی ہوتا ہے۔

شہد کی پیداوار بھی اموال ظاہرہ میں شامل ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ ہے۔ یہ حکم اس زمانے کا ہے جب جنگل یا زمین میں شہد کے چھتے اکا دکا ہوا کرتے تھے، موجودہ دور میں شہد کا کاروبار ایک منفعت بخش صنعت ہے۔ لہٰذا بیت المال میں اس ذریعے سے ہونے والی آمدنی کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃ کی تحصیل کے لیے تیسرا ذریعہ مویشی ہیں۔ چار اونٹوں تک کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ پانچ اونٹ ہوں تو ایک سال بعد ان پر ایک بکری بطور زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ مویشیوں پر زکوٰۃ کے بارے میں تفصیلی ہدایات صحیح بخاری کی کتاب الزکوٰۃ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ چراہ گاہوں اور جنگلوں میں چرنے والے پالتو مویشیوں پر بھی زکوٰۃ ہے جس کے تفصیلی احکام کُتب فقہ میں ملتے ہیں۔ اس طرح بھیڑوں اور بکریوں پر بھی زکوٰۃ ثابت ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جملہ اقسام کی زکوٰۃ بیت المال کے وسائل آمدن میں سے ایک ذریعہ تھا جس سے بڑی حد تک مملکت کے معاملات چلائے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ خلفائے راشدین کے دور میں اس میں بعض مفید اضافے ہوئے۔ اس کی تحصیل کے لیے باقاعدہ شعبے قائم ہوئے۔ اخراجات کی مدوں کا باقاعدہ مطالعہ کر کے ان میں تبدیلی کی گئی۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی ان مدات کو ختم کیا گیا۔

اموی اور عباسی حکمرانوں کے عہد اقتدار میں بھی زکوٰۃ کا نظام کسی نہ کسی شکل میں چلتا رہا۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی وحدت کئی حصوں میں تقسیم ہو جانے کے باوجود بھی نظام زکوٰۃ حکومتی سطح پر چلتا ہی رہا اور یہ سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب مسلمان استعماری طاقتوں کے زیرِنگیں آگئے۔ ان طاقتوں نے مسلم معاشرے کے تار و پود بکھیر کر اپنی تہذیب کو تعلیم، قانون، تمدن، اخلاقیات، مذہب، عائلی زندگی، سیاست، معیشت غرضیکہ ہر شعبے کے ایک ایک گوشے میں داخل کیا۔ اسلامی ممالک حکومتی سطح پر اور افراد انفرادی سطح پر اس تہذیب سے آج بھی نبردآزما ہیں۔

وسائل آمدنی کی درجہ بندی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بیت المال انہی پانچ مذکورہ ذرائع سے چلایا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے وسائل ایسے تھے جن کے احکام نازل تو ہوئے تھے لیکن ان کی تنفیذ کی کوئی باقاعدہ شکل سامنے نہ آئی

تھی۔ ان کی تفصیل آئندہ سطور میں آ رہی ہے۔ بعض وسائل ایسے تھے جن کو کسی دوسرے ذریعے پر قیاس کر کے حاصل کیا گیا۔ یہ سب کچھ قرآن سنت سے ماخوذ تھا۔ فقہاء نے تمام وسائل کی درجہ بندی کی، ان کے لیے اصطلاحات وضع کیں اور یوں اس علم نے اب ایک باقاعدہ سائنس کی صورت اختیار کر لی ہے۔

کسی اسلامی ریاست کے وسائل آمدنی کو ان کی منطقی ترتیب کے لحاظ سے یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مسلمانوں سے حاصل ہونے والے اموال
۲۔ غیر مسلموں سے حاصل ہونے والے اموال
۳۔ قدرتی وسائل
۴۔ مجہول مال اور غیر روایتی ذرائع
۵۔ ٹیکس

اس ترتیب پر سرسری سا غور کرنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلامی ریاست اور لادین ریاست میں کتنا بڑا فرق ہے۔ اسلام ریاستی نظام چلانے کے لیے اوّلاً تو اپنے ماننے والوں سے مال و دولت کا تقاضا کرتا ہے۔ سب سے پہلے ان ہی کے اموال میں سے کچھ حصہ حاصل کر کے ریاست کے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد غیر مسلموں سے حاصل ہونے والے اموال آتے ہیں جن میں سے بڑی قسم ان اموال کی ہے جو غیر مسلم رعایا، باجگزار یا متحارب اپنی رضامندی سے دیں۔ اس مال کے خرچ کی حدود بھی بڑی حد تک فلاح و بہبود کے منصوبوں تک محدود ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مواقع پر تو غیر مسلموں کے اموال انہی پر خرچ ہوتے ہیں۔ پھر اسلام ان اموال پر ریاست کا تصرف قائم کرتا ہے جو حقیقت میں اللہ کی ملکیت ہیں، انسان کے عمل یا محنت کا نتیجہ نہیں ہیں۔ یہاں پر بھی سارا مال تو کیا اس کا بہت بڑا حصہ مال پر قبضہ قدرت رکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مجہول مال میں سے تصرف کیا جاتا ہے (مجہول مال وہ ہے جس کے بارے میں علم نہ ہو کہ یہ کس کا ہے)۔ سب سے آخر میں ٹیکسوں کی باری آتی ہے اور ٹیکس بھی انتہائی ضرورت پڑنے پر عائد کیے جاتے ہیں۔ یہ ایسا وسیلہ آمدنی نہیں جس کا حصول ہر صورت میں ضروری ہو بلکہ جب تک ان کی جائز ضرورت نہ ہو شریعت میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ مذکورہ بالا موضوعات کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ مسلمانوں سے حاصل شدہ وسائل

اسلامی ریاست میں انسانی زندگی کے معاملات کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو حکومتی اثر و نفوذ سے پاک ہوتی ہے۔ اس بات کو ذرا دوسرے انداز میں بیان کیا جائے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے اللہ کریم نے قانون سازی

میں اس بات کا بطور خاص خیال رکھا ہے کہ مسلم معاشرہ سے غربت کا مسئلہ، پس ماندگی کا مسئلہ اور دوسرے مسائل اس طرح حل ہوں کہ ان میں لوگوں کو اپنی شرکت زیادہ سے زیادہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں معاشی مسائل حل کرنے کے لیے رضاکارانہ طریقوں کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون بڑی حد تک پرائیوٹ لاء ہے جس میں ریاست و حکومت کا کردار بہت بڑی حد تک رابطہ کار کا سا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی قانون میں حاکم اللہ کی ذات ہے اور عوام اس کی اتباع کرتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگ حکومت کو ٹیکس دیں یا نہ دیں زکوٰۃ کا اہتمام ضرور کرتے ہیں۔ ان رضاکارانہ ذرائع کے بعد لازمی طریقوں سے مال حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں طریقے اس طرح ہیں:

(الف) رضاکارانہ طریقے

اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ ریاستی ذرائع کے ساتھ ساتھ رضاکارانہ طریقے سے بھی معاشرے میں توازن پیدا کیا جائے۔ اسلامی حکومت بھی یقیناً لوگوں کی فلاح کے لیے کام کرتی ہے لیکن اوّلاً افراد کی انفرادی فلاح کا تعلق دولت مند افراد کے ایمان اور عبادت میں مالی جرمانوں سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ وہ آمدنی ہے جو مسلمانوں سے وصول کر کے دوسرے لوگوں پر ریاست کی مداخلت کے بغیر خرچ ہوتی ہے۔ معاشرے کے نادار طبقے پر خرچ ہونے والی اس آمدنی کی چند مثالیں یہ ہیں۔ ذرا غور کر کے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات عام ہونے سے کس قدر معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں:

۱۔ جو شخص بغیر کسی عذر کے جان بوجھ کر روزہ توڑے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ہر روزے کے بدلے میں مسلسل ساٹھ روزے رکھے اور اگر بیچ میں کوئی روزہ چھوٹ جائے تو نئے سرے سے ساٹھ روزے پورے کرے۔ ظاہر ہے ایسا کرنا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ گنجائش رکھی گئی کہ ساٹھ غریب آدمیوں کو ایک وقت کھانا کھلائے جو کفالت اجتماعیہ کے لیے ایک ترغیب ہے۔ کروڑوں افراد کے مسلم معاشرے میں ایسے ایک کروڑ افراد ایک روزہ بھی چھوڑیں تو کروڑوں افراد سال بھر پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ مزید غور قارئین کے ذمہ ہے۔

۲۔ قسم کھا کر توڑنا یا پوری نہ کرنے والے کے لیے لازمی ہے کہ تین روزے رکھے یا دس غریب افراد کو کھانا کھلائے۔ ظاہر بات ہے کہ بڑی بڑی آبادیوں کے کروڑوں افراد میں لاکھوں افراد قسمیں کھائیں گے اور لاکھوں توڑیں گے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کروڑوں ناداروں کو کھانا کھانے کو ملے گا۔ زیریں سطح پر یہ رضاکارانہ کفالت اجتماعیہ کی ایک عمدہ مثال ہے۔

۳۔ دولت مند افراد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر ڈرایا کہ ''وہ شخص جنت کی ہوا سے محروم رہے گا

جس نے خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھایا لیکن اس کا پڑوسی بھوکا سویا ہو۔'' اس فرمان کے بعد مومنین کے معاشرے میں کسی کے غریب باقی رہنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔

۴۔ ہر سربراہ خانہ کا فرض ہے کہ صاحب نصاب ہونے پر عیدالفطر کی نماز ادا کرنے سے قبل گھر کے تمام افراد کی تعداد کے اعتبار سے غریبوں میں صدقہ فطر تقسیم کرے جس کی مقدار تقریباً ایک فرد کے ایک وقت کے کھانے کے برابر ہے۔ (صاحب نصاب وہ شخص ہے جس کے پاس نقدی یا دوسری شکل میں اتنا مال ہو کہ سال کے بعد اس پر زکوٰۃ فرض ہو)۔

۵۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر صاحب حیثیت لوگوں پر جانوروں کی قربانی لازمی قرار دی۔ قربانی کے گوشت میں سے غریب و نادار افراد کے لیے بھی حصہ رکھا گیا ہے(۹)۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعوت ولیمہ کو بدترین قرار دیا جس میں صرف امیر لوگ بلائے جائیں غریبوں کو نہ بلایا جائے(۱۰)۔ غریبوں کے ساتھ امیروں کے مساوی سلوک کے لیے یہ ایک ترغیب ہے۔

۷۔ حالت حیض میں بیوی سے جنسی تعلق قائم کرنے والے مرد کے لیے لازمی ٹھہرایا کہ وہ ایک حالت میں ایک دینار اور دوسری حالت میں نصف دینار خیرات کرے(۱۱)۔ یہ بھی غربت کم کرنے کی ایک شکل ہے۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں جن میں اللہ کریم نے معاشرے میں توازن قائم کرنے کے لیے افراد کو باہمی الفت محبت اور بھائی چارے کی تعلیم دی ہے۔ ان تمام مثالوں پر ان کی روح کے مطابق عمل کیا جائے تو ایسے مسلم معاشرے میں نہ تو غربت نظر آ سکتی ہے اور نہ ناداری! اس کے علاوہ بھی کئی ترغیبات، مالی جرمانے اور مالی عبادات جیسے ظہار کفارہ اور ایک دوسرے کو تحائف دینے کی ترغیب وغیرہ، ہمیں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے مطالعہ سے ملتی ہیں۔ ان سب کا زیادہ تعلق چونکہ اسلام کے اخلاقی نظام سے ہے اس لیے یہاں اتنا تذکرہ ہی کافی ہے۔ مندرجہ بالا سات نکات پر قارئین خود غور کریں تو عقل دنگ رہ جائے گی کہ اللہ کریم نے کس قدر سادہ لیکن موثر معاشی اصول وضع کیے ہیں۔

(ب) لازمی طریقے

۱۔ نقدی، سونے چاندی اور اموال تجارت پر اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ کی کٹوتی۔ لیکن یاد رہے کہ زکوٰۃ عبادت ہے ٹیکس نہیں۔

۲۔ زمین کی زرعی پیداوار میں سے عشر کی وصولی، جس کی دو اقسام ہیں:

الف۔ قدرتی ذرائع آبپاشی کے ذریعے، جن میں کاشت کار کی محنت شامل نہ ہو، سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار سے دس فی صد پیداوار کی وصولی۔

ب۔ مصنوعی ذرائع آبپاشی والی زمین سے پانچ فیصد پیداوار کی وصولی۔

۳۔ سبزیوں میں سے عشر کی وصولی۔ یہ امام ابو حنیفہ ؒ کی رائے ہے جو سبزیوں کو زرعی پیداوار میں شمار کرتے ہیں۔ امام ابو یوسف ؒ اور امام محمد ؒ کا خیال ہے کہ سبزیوں کی پیداوار میں سے عشر لینا درست نہیں۔ چونکہ جس حدیث کو بنیاد بنا کر انہوں نے سبزیوں کو عشر سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اس کے بارے میں امام ترمذی نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔ اس لیے امام ابو حنیفہ ؒ کی رائے زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے جو سبزیوں میں سے عشر کی وصولی جائز قرار دیتے ہیں۔

۴۔ پھل دار درختوں کی پیداوار کے عشر اور نصف عشر کا دارومدار آبپاشی کے ذریعے پر ہے۔ اگر درختوں کی آبپاشی قدرتی طریقے سے ہو رہی ہو تو دس فیصد کے حساب سے۔ اگر کاشتکار کی محنت سے پودوں کو پانی دیا جا رہا ہو تو پانچ فیصد کے حساب سے عشر واجب ہے۔

۵۔ شہد پر بھی عشر واجب ہے۔

۶۔ پانچ یا اس سے زائد اونٹوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اس طرح ان بھیڑ بکریوں اور مویشیوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہے جو کھیتی باڑی کے مقصد کے لیے نہ ہوں۔

مسلمان آبادی سے حاصل ہونے والی یہ آمدنی نہ صرف ریاست کے مالی وسائل میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے اس میں یہ ترغیب بھی ہے کہ اس سے اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام ذرائع آمدنی مختلف اسلامی معاشروں میں حکومتی سطح پر نہ سہی، انفرادی سطح پر غرباء اور مساکین کو حاصل ہوتے ہیں۔ اپنے دائیں بائیں دیکھ لیجئے! مسلمان دولت مندوں کی بہت بڑی تعداد سرکاری ٹیکس دے یا نہ دے، کم از کم غرباء کو زکوٰۃ دینے کا اہتمام ضرور کرتی ہے۔ جہاں تک عشر کا تعلق ہے، تو وہ زمیندار اور کاشتکار جو اس کے احکام کے بارے میں علم رکھتے ہیں، اپنی بساط کی حد تک اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ رہا معاملہ مویشیوں اور شہد پر زکوٰۃ کا، تو اس بارے میں مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ ان احکام سے لاعلم ہے اور جن اہل علم اصحاب کو ان احکام کے بارے میں کچھ علم ہے وہ ان اشیاء کے مالک نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا مالی عبادات انفرادی ہیں جن کے ادا کرنے کو یقینی بنانے کے لیے کوئی مشینری بھی درکار ہوتی ہے۔ اگر حکومتی مشینری کا وجود نہ ہو تو بھی صاحب نصاب افراد پر ان مالی عبادات کی ادائیگی ساقط نہیں ہوتی بلکہ وہ سب اپنے مال کو از خود پاک کرنے کا اہتمام کرنے کے پابند ہیں۔ انفرادی سطح پر یہ فرض ادا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ زکوٰۃ، عشر اور نصف عشر ٹیکس ہرگز نہیں ہیں بلکہ اللہ اور بندے کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

۲۔ غیر مسلموں سے حاصل شدہ وسائل

غیر مسلموں سے بعض اقسام کے ٹیکس وصول کیے جا سکتے ہیں۔ مسلمانوں سے حاصل ہونے والے ذرائع اور غیر مسلموں سے حاصل ہونے والے ذرائع میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر عبادت کے زمرے میں آتے ہیں لہٰذا افراد انفرادی طور پر پابند ہیں کہ وہ زکوٰۃ عشر وغیرہ اپنے طور پر لازماً ادا کریں لیکن موخرالذکر نہ عبادت ہیں اور نہ مسلمانوں کا کوئی لازمی حق۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے وصول کرنے کے لیے کسی مقتدر کا ہونا ضروری ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ از خود غیر مسلموں سے اسلام کے نام پر اللہ کے مقرر کردہ ٹیکس وصول کرے۔ نہ اسلامی حکومت کو یہ اختیار ہے کہ اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ٹیکس وصول کرے۔ کسی غیر مسلم سے لیا جانے والا ہر ٹیکس اس کی روح کو سمجھ کر وصول کیا جائے۔ جزیہ کی روح یہ ہے کہ ذمیوں کے جان و مال کو بیرونی دشمنوں کے شر سے بچایا جائے یہ ممکن نہ ہو تو کسی اسلامی ریاست کو ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

عمومی طور پر اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے حاصل ہونے والے ٹیکس اور ذرائع آمدنی تین طرح کے ہیں جن کا تعارف یہ ہے:

(الف) ہنگامی وسائل

اسلامی ریاست کو یہ وسائل بعض خاص حالتوں میں حاصل ہوتے ہیں، یہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ قرآن و سنّت میں ان کے احکام مذکور ہیں اور ماضی کے مسلمان ممالک میں ان کی وصولی بھی ہوتی رہی اس لیے ان کا تذکرہ بے معنی نہ ہوگا۔

(الف) فے: اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

(ب) جزیہ: اس کا تعارف بھی گزر چکا ہے۔

(ج) مالِ غنیمت: یہ بھی معروف ذریعہ ہے۔

(د) تاوانِ جنگ: کسی دوسری غیر مسلم ریاست سے جنگ کے بعد جب اس کا تعین ہو جائے کہ یہ جنگ غیر مسلم ریاست کے غلط رویہ کی وجہ سے مسلّط ہوئی اور اسلامی ریاست کے پاس اتنی طاقت بھی ہو کہ وہ دبدبہ اور قوت کے ساتھ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس ملک سے صلح کی شرائط طے کر سکے تو اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جارح ملک سے وہ سارے اخراجات وصول کیے جائیں جو اسلامی ریاست کو جنگ کی وجہ سے اٹھانا پڑے۔ اسے تاوان جنگ کہتے ہیں۔ لیکن تاوان جنگ کو ہم مکمل طور پر ذریعہ آمدنی شمار نہیں

کر سکتے کیونکہ یہ ان جنگی اخراجات کی واپسی ہوتی ہے جو پہلے ہو چکے ہوتے ہیں۔

ب۔ اتفاقی وسائل

اتفاقی وسائل بھی کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں ہیں۔ لہذا حکومت کے سالانہ میزانیہ (Budget) میں ان کی تعیین (Forecast) نہیں ہوسکتی۔ ان کا حصول واضح اور یقینی ہونے کی بجائے مبہم اور غیرواضح ہوتا ہے۔ اتفاقی وسائل آمدنی کی چند مثالیں یہ ہیں:

(ا) لاوارث میت کا ترکہ

لاوارث میت کا ترکہ اصطلاحاً اموال فاضلہ میں سے ایک ہے۔ اموال فاضلہ کو ہم متفرقات بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ ترکہ ہے جو کسی ایسے شخص نے چھوڑا ہو جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ ایسے ترکے کی تمام منفعت حکومت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

(ب) مرتد کی جائیداد

اسلام چھوڑ کر کفر کی کوئی شکل اختیار کرنے والے شخص کا تعلق اپنے مال سے ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا ایسے شخص کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد ضبط کر کے سرکاری خزانے میں داخل کر دی جاتی ہے۔ یہ بھی اموال فاضلہ کی ایک قسم ہے۔

(ج) وقف

کوئی غیر مسلم شخص اپنی جائیداد رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کر دے تو اس سے فوائد حاصل کرنے کے لیے شریعت کے اندر رہتے ہوئے اس کی موت پر وصیت کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ وقف کے تفصیلی احکام کتب فقہ میں دیکھے جا سکتے ہے۔

ج۔ مستقل وسائل

مستقل وسائل آمدنی کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ زمین کا کرایہ

سرکاری زمینوں کا نظام چلانے کے لیے حکومت کے پاس کئی شرعی طریقے ہوتے ہیں۔ حالات اور علاقے کے رسم و رواج کے مطابق کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک طریقہ زمینوں کو سالانہ اجرت پر دینا ہے۔ اس کا نام زمین کا کرایہ ہو، اسے محصول کے نام سے موسوم کیا جائے یا اسے لگان کہا جائے، بات ایک ہی

ہے۔ بنیادی طور پر یہ وہ زمین ہوتی ہے جو کسی مفتوحہ علاقے میں ہو اور جس کے مالکان اسے خالی کر کے کہیں چلے جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایسی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے دور میں اسے تقسیم کرنے کے بجائے مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا گیا۔

اس طرح دی گئی زمین مسلمان کے پاس بھی ہو سکتی ہے اور غیر مسلم کے پاس بھی۔ ہر دو صورتوں میں اس پر نہ عشر واجب ہے اور نہ خراج، کیونکہ زمین کے حقوق ملکیت ریاست کے پاس ہوتے ہیں، اس لیے عشر یا خراج عائد نہیں ہو سکتا۔ صرف وہی کچھ وصول ہوتا ہے جو فریقین کے درمیان معاہدہ کے وقت طے ہوا ہو۔

(ب)۔ عشور (درآمدی ٹیکس)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس طرح کا کوئی ٹیکس موجود نہ تھا۔ اس کی ابتداء حضرت عمرؓ کے دور میں اس وقت ہوئی جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ ایران اور روم میں داخل ہونے والے مسلمان تاجروں سے وہاں کی حکومتیں درآمدی اشیاء پر ٹیکس وصول کرتی ہیں۔ ادھر اسلامی ریاست میں داخل ہونے والے غیر مسلم تاجروں سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ یوں تجارتی توازن غیر مسلم تاجروں کے حق میں چلا جاتا تھا، غیر مسلموں پر کوئی ٹیکس نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اشیاء سستی ہوتی تھیں۔ مسلمان تاجروں کی اشیاء ٹیکس کی وجہ سے مہنگی ہو کر صارفین تک پہنچتی تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے علم میں جب یہ بات آئی تو انہوں نے اپنے تمام گورنروں کو ایک حکم نامہ جاری کیا کہ بلاد غیر کے تاجروں سے ٹیکس وصول کیا جائے جتنا ان کی حکومتیں مسلمان تاجروں سے وصول کیا کرتی ہیں۔

(ج)۔ خراج

اسلامی ریاست کی سرحدیں وسیع ہو جانے کی بعد اس کے وسائل آمدنی میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ انہی میں سے ایک مستقل ذریعہ خراج بھی تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

۳۔ قدرتی وسائل

ذرائع آمدنی میں سے قدرتی وسائل بھی ایک بڑا اور اہم ذریعہ ہیں۔ قدرتی وسائل دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو حکومت کے اپنے تصرف میں ہوں، جیسے سرکاری زمینوں میں سے کسی معدنی ذخیرہ کا دریافت ہونا۔ یہ ذخیرہ سب کا سب حکومتی ملکیت میں رہتا ہے۔ دوسرے وہ وسائل ہیں جو درحقیقت قدرتی ہیں لیکن جس ذریعہ سے حاصل ہوں وہ کسی شخص کی ملکیت میں ہو، جیسے کسی زمین میں سے کوئلہ لوہا وغیرہ دریافت ہونا۔ یہ دراصل قدرتی وسائل سے ہیں۔ ان کی تخلیق اور پیدائش میں انسان کی تدبیر کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن وہ ذریعہ یعنی زمین جہاں سے

یہ حاصل ہوں، کسی دوسرے کی ملکیت ہو سکتی ہے۔ ایسے وسائل یوں تو زمین کے مالک کے لیے ایک عطیہ اور نعمت ہیں لیکن اس میں حکومت کا بھی ایک حصہ ہے جس کے خرچ کے لیے بعض مدیں (Heads) ہیں۔ قدرتی قدرتی وسائل مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ معدنی وسائل

عربی میں انہیں رکاز کہتے ہیں۔ رکاز کے معنی میں نہ صرف معدنی وسائل آتے ہیں بلکہ زمین میں مدفون مال بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ کچھ لوگ سونے چاندی کے سکے اور زیورات حفاظت کے نقطہ سے خفیہ طور پر زمین میں دبا دیتے ہیں جس کی خبر کسی دوسرے کو نہیں ہوتی، ضرورت پڑنے پر نکال لیتے ہیں۔ بسا اوقات دبانے والا شخص اچانک فوت ہو جاتا ہے اور اس کے دبائے ہوئے خزانوں کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں ہوتا۔ مدتیں گزر جانے کے بعد لوگ مکان وغیرہ کی بنیادوں کے لیے زمین کھودتے ہیں تو ایسے دفینہ برآمد ہوتے ہیں۔ فقہ میں ایسے مال کے بارے میں خاص احکام ہیں۔ یہ رواج اب بہت کم ہو گیا ہے لیکن دیہی معاشروں میں اب بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ دفینوں کے احکام پر بحث کے لیے ضروری نہیں کہ ان کا رواج اب بہت کم ہو گیا ہے۔ معدنی وسائل کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ قرآن و سنّت میں سے معدنی وسائل کے بارے میں حاصل ہونے والی معلومات سے کوئی واضح حکم نہیں ملتا۔ ابو عبید کی "کتاب الاموال" اور امام ابو یوسف کی "کتاب الخراج" میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے حاصل ہونے والے سونے اور چاندی کو فقہاء نے دفینوں اور معدنی وسائل میں تقسیم کیا ہے۔ دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ پھر معدنی وسائل کو بھی دو انواع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو غیر مملوکہ زمینوں سے حاصل ہوں۔ ان معدنیات کے بارے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ غیر مملوکہ زمین ریاست کی ملکیت ہوتی ہے اور وہاں سے حاصل ہونے والی معدنیات بھی حکومت کے اختیار میں آجاتی ہیں۔ سرکاری زمینوں میں سے کسی شخص کو کوئی معدن ملے تو اس کے احکام الگ ہیں۔

دوسری معدنیات لوگوں کی مملوکہ زمینوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایسی معدنیات پر فقہاء کی دو آراء ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ لوگوں کی مملوکہ زمین میں سے حاصل شدہ معدنیات لوگوں ہی کی ملکیت ہیں کیونکہ یہ زمین کے تابع ہیں۔ ایسی آمدنی کا خمس یعنی کل آمدنی کا بیس فیصد بیت المال میں چلا جاتا ہے۔ لیکن امام مالک کا خیال ہے کہ لوگوں کی مملوکہ زمین سے حاصل ہونے والی معدنیات سلطان کی صوابدید پر ہیں اور ریاست کے تصرف میں آجاتی ہیں۔

کسی دور میں معدنی وسائل میں چند اشیاء ہی شامل تھیں۔ لیکن علوم طبعی میں غیر معمولی تبدیلیوں کے باعث اب ان کی فہرست بہت طویل ہو چکی ہے۔ البتہ ان کے احکام اب بھی وہی ہیں جو فقہاء نے قرآن و سنّت سے

مستنبط کیے ہیں۔ رکاز کی تعریف پر چاروں فقہی مسلک متفق نہیں ہیں۔ ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ رکاز میں صرف دفینہ شامل ہیں۔ دوسرے فقہاء کے خیال میں اس میں معدنی وسائل بھی آتے ہیں۔ کئی روایات سے پتا چلتا ہے کہ رکاز اور معدن دو مختلف چیزیں ہیں[۱۳]۔ اگر رکاز سے مراد صرف دفینہ لی جائے تو ان پر زکوٰۃ ہے لیکن کانوں کی آمدنی بھی شامل کر لی جائے تو خمس عائد ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی رائے میں کانیں رکاز میں شامل ہیں۔

اگر یہ بات طے کر لی جائے کہ جملہ معدنی وسائل رکاز کی تعریف میں آتے ہیں تو موجودہ دور میں گیس، پٹرول، بعض کیمیائی مرکبات کے معدنی ذخائر، کوئلہ اور بیش قیمت جوہری دھاتوں پر اسی کا حق ہے جس کی زمین سے یہ خزانے برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن کل پیداوار کا بیس فیصد حکومتی ملکیت میں چلا جاتا ہے۔ اسے خمس یعنی پانچواں حصہ کہتے ہیں۔

بعض معدنی ذخائر ایسے ہیں جو موجودہ زمانے میں دراصل حکومتی تصرف میں رہتے ہیں۔ جیسے جوہری دھاتیں اور اہم کیمیائی مرکبات وغیرہ۔ ان وسائل کا خمس منہا کرنے کے بعد زمین کے مالک کو مکمل اختیار دے دینا مفاد عامہ میں نہیں ہوتا۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تمام پیداوار حکومت خرید لے اور اس کی اسی فی فیصد قیمت اس شخص کو دے دی جائے جس کی زمین میں یہ خزانہ برآمد ہوا ہو۔ لیکن جدید دور میں ایک رائے یہ بھی سامنے آئی ہے کہ تمام معدنی وسائل ریاست کی ملکیت ہیں۔ تفصیل کے لیے ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کی ''اسلام کا نظریہ ملکیت'' حصہ دوم ملاحظہ کیجئے۔

ب۔ سمندری پیداوار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مملکت کی سرحدیں سمندر سے متصل نہیں تھیں اس لیے ہمیں قرآن و سنت میں اس بارے میں کوئی واضح حکم نہیں ملتا کہ سمندری پیداوار میں زکوٰۃ، عشر یا خمس وصول کیا جائے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں جب فتوحات کے باعث سمندر بھی مملکت کی حدود میں شامل ہوئے تو انہوں نے سمندری موتیوں کی آمدنی سے محصول وصول کرنا شروع کر دیا۔ یہ مقدار بھی رکاز کے خمس کے برابر تھی۔ اس طرح کل سمندری پیداوار کا بیس فیصد حکومتی ملکیت میں چلا جاتا اور باقی پیداوار حاصل کرنے والا لے لیتا تھا۔

حضرت علی نے پانی کی دوسری پیداوار کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ سمندروں، دریاؤں اور جھیلوں سے پکڑی جانے والی مچھلیاں بھی اسی ذیل میں شمار کی گئیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے مچھلیوں پر وہی زکوٰۃ عائد کی جو نقود پر تھی یعنی اڑھائی فیصد۔ لیکن اس میں اور نقود پر سال کے بعد زکوٰۃ کا ادا کرنا واجب تھا اور مچھلیوں کی کل پیداوار پر اڑھائی فیصد کے حساب سے محصول فوراً ہی وصول کر لیا جاتا تھا۔ باقی سمندری وسائل کو انہوں نے معادن پر قیاس

کرتے ہوئے خمس عائد کر دیا۔ ان وسائل میں موتی اور عنبر شامل تھے۔ موجودہ دور میں سمندری پیداوار میں چند چیزیں اور بھی شامل ہو گئی ہیں۔ آبی گزرگاہوں سے آمدنی، جیسے نہر سویز سے حکومت مصر کو جہازوں کے گزرنے پر بطور ٹیکس معقول آمدنی ہوتی ہے۔ سمندر سے معدنی وسائل کا دریافت ہونا، کسی نئے جزیرے کا ابھر آنا، بندرگاہوں پر کھڑے جہازوں سے محصول اور بحری ٹرانسپورٹ وغیرہ یہ سب جدید وسائل آمدنی ہیں۔ ایک نہر سویز یا نہر پانامہ ہی کو لے لیجئے جن کے باعث جہاز رانوں کو ازحد مختصر راستے مل گئے ہیں۔ دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگا ہے۔ دوسری طرف ان نہروں پر ہونے والے اخراجات بھی کچھ کم نہ تھے۔ لہذا جن ملکوں کی حدود میں یہ نہریں واقع ہیں ان کی حکومتوں نے گزرنے والے جہازوں پر محصول عائد کر رکھا ہے۔ سمندری پیداوار پر محصول عائد کرنا امام کے اختیارات میں سے ہے اور اس اختیار کا استعمال اسی حد تک جائز ہے جتنی اس کی ضرورت ہو۔

ج۔ جنگلات سے آمدنی

جنگلات اگر ریاست کی اپنی مِلک میں ہوں تو ان کی پیداوار مکمل طور پر ریاستی ملکیت میں داخل کی جاتی ہے۔ جنگلات سے ہونے والی آمدنی بھی کثیر الذرائع ہے۔ جنگلی جانوروں اور پرندوں کے شکار کے لیے لائسنس فیس، لکڑی کی صورت میں پیداوار، گھاس کی سالانہ فروخت سے آمدنی، بعض درختوں سے کیمیائی مرکبات کی پیدوار، بعض جنگلی پھل، میوے اور جڑی بوٹیاں، یہ سب جنگلات سے حاصل ہوتے ہیں جو مملکت کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک علاقہ دومۃ الجندل کے گرد و نواع میں واقع جنگلات کو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا تھا۔ ان جنگلات سے ہونے والی آمدنی بیت المال میں داخل کر دی جاتی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایران و عراق فتح کرنے کے بعد ان علاقوں میں واقع جنگلات کو قومی ملکیت قرار دیا تھا۔ یہ ان جنگلات کا ذکر ہے جو پہلے سرکاری ہوں یا فتح کے بعد حکومت کے پاس آئیں یا ان کا مالک نہ ہو۔ رہے وہ جنگلات جو کسی شخص کی نجی ملکیت میں ہوں یا کسی نے اپنی زمینوں میں درخت اگا کر انہیں جنگلات میں تبدیل کر دیا ہو تو ان کے احکام وہی ہیں جو نجی ملکیت کے مختلف احوال کے لیے بیان کیے جا چکے ہیں۔

۴۔ مجہول مال اور غیر روایتی ذرائع

یہ مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں:

الف۔ مجہول مال

اس سے مراد وہ مال ہے جس کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ اس کا مالک کون ہے ایسے مال کو ''لُقطہ'' کہتے ہیں۔ لُقطہ سے مراد گری پڑی اشیاء ہیں۔ ایسی اشیاء جس شخص کو ملیں اس پر واجب ہے کہ ان کے مالک کا کھوج

لگائے اور حتی المقدور تلاش کرے۔ حالات اور زمانے کے مطابق، جیسے آج کل لاؤڈاسپیکر کے ذریعے، اعلان کرے۔ تمام کوشش کے باوجود گری پڑی اشیاء کا مالک نہ ملے تو ایک سال تک انتظار کرنے کے بعد ان اشیاء کو صدقہ کر دے۔ اگر خود غریب ہے تو اپنے اوپر صدقہ کر سکتا ہے۔

مجہول مال کسی سرکاری ادارے کے کارندے کو بھی مل سکتا ہے۔ مثلاً پولیس گشت کے دوران لقطہ کی شکل میں ملنے والی اشیاء اور لاوارث مویشی وغیرہ۔ یہ اشیاء فرائض منصبی ادا کرنے کے دوران ملیں تو سرکاری عمل دخل میں آجاتی ہیں اور ان کے مالکان کا کھوج لگانا سرکاری طور ہی پر ممکن ہے۔ جس شخص کو ملیں وہ انہیں ذاتی حیثیت میں نہ لے کیونکہ ممکن ہے اگلے دن اس کو کسی دوسرے دور افتادہ مقام پر تبدیل کر دیا جائے اور ذاتی طور پر اس کے لیے لقطہ کے مالک کا کھوج لگانا ممکن نہ ہو جائے۔ یہ کام سرکاری طور ہی پر انجام دیا جائے اور آخر کار اس مجہول مال کو سرکاری خزانے ہیں داخل کردیا جائے۔ غیر روایتی ذرائع آمدنی میں لاوارث میت کا مال بھی شامل ہے جو بالآخر بیت المال کی ملکیت قرار پاتا ہے۔

ب۔ غیر روایتی ذرائع

آج کل کے دور میں غیر روایتی ذرائع آمدنی میں بہت وسعت پیدا ہو چکی ہے۔ دریاؤں کو روک کر نظام آبپاشی قائم ہوتا ہے تو اس کے ساتھ دوسرے کثیر المقاصد منصوبے بھی شروع کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ بجلی پیدا ہوتی ہے جس کی فروخت سے حکومتوں کو کثیر آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ کرنسی نوٹوں کی چھپائی ہر ملک اپنے لیے تو کرتا ہے، دوسرے ممالک بھی ان کی چھپائی کے لیے رجوع کرتے ہیں جس سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ ہوائی اڈدوں پر راہداری کی سہولتیں دینے پر دوسرے ملکوں کی ہوائی کمپنیوں سے کثیر آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ خانہ جنگی، امن و امان کی ابتر حالت اور دفاعی ضروریات کی وجہ سے بسا اوقات دوسرے ملکوں کو فوجیں بھیجنا پڑتی ہیں جس کے عوض متعلقہ ملک سے فوجی خدمات کا معاوضہ حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آمدنی کا ایک غیر یقینی اور غیر روایتی ذریعہ ہے۔ بہت سے ممالک میں اہم ریاستی اجارہ داری ہوتی ہے۔ یہ آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ بعض ممالک اپنے ہاں کسی خاص شعبے میں ماہر افراد نہ ہونے پر دوسرے ممالک سے خطیر مشاہرے پر ان ماہرین کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ معاملہ متعلقہ فرد اور ضرورت مند ملک کے درمیان ہی طے پاتا ہے لیکن کئی صورتوں میں دو حکومتیں بھی معاہدہ کر کے افراد کی خدمات ایک دوسرے کے سپرد کرتی ہیں جس کے عوض افراد کے ساتھ حکومتوں کو بھی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ بھی غیر روایتی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

۵۔ ٹیکس

گزشتہ سطور میں مذکور تمام ذرائع آمدنی کے حصول کے بعد بھی اگر حکومتی وسائل ریاستی نظام چلانے سے قاصر ہوں تو ٹیکسوں کے نفاذ کا راستہ باقی رہتا ہے جس کے ذریعے باقی حکومتی اخراجات پورے کیے جا سکتے ہیں۔

دور جدید میں بیشتر مسلمان ممالک کی آمدنی کے وسائل وہ نہیں ہیں جو خلافت راشدہ اور اس سے متصل بعد کے ادوار میں تھے۔ یہ درست ہے کہ آمدنی کے وسائل، حکومتی اداروں کی ہیئت، افراد کے ذرائع آمدنی اور اخراجات کے اسلوب، یہ سب کچھ یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ اس لیے حکومتی وسائل آمدنی میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے۔ لیکن جس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ایک مثالی اسلامی ریاست کے اخراجات خالصتاً مادی وسائل سے پورا کرنے کی بجائے عبادات کے ذریعے پورے کیے جاتے ہیں۔ عبادات انسان کے اپنے رب کے ساتھ تعلق کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کے بعد غیر مسلم آبادی کی باری آتی ہے۔ اس کے ساتھ متوازی قدرتی وسائل کے ذریعے بھی امور سلطنت چلائے جاتے ہیں۔ ٹیکس نافذ کرنے کی ضرورت سب سے آخر میں پیش آتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں ریاست و حکومت کا مقصد ذرائع آمدنی میں اضافہ نہیں بلکہ لوگوں کا اپنے رب کے ساتھ تعلق مضبوط کرنا ہے۔ ان کی طبعی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قبل لوگوں کے سیرت و کردار کو سنوارنا اولین فریضہ ہے۔ جس کا فطری نتیجہ ہے کہ فلاحی ریاست خود بخود وجود میں آئے نہ کہ مصنوعی طریقے سے فلاحی ریاست وجود میں لائی جائے جس سے خاندانی اور معاشرتی نظام ہی درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ ذرا نام نہاد فلاحی ریاستوں کے اندر جھانک کر دیکھئے۔ سطحی مطالعہ ہی سے اندازہ ہو جائے گا کہ خوشحال اور تمام سہولتوں سے مزین زندگی گزارنے والا انسان وہاں کس قدر تنہا ہے۔ جب سربراہ خانہ کی بجائے ریاست افراد کی کفالت کرنا شروع کر دے تو خاندانی نظام کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ایک حاکم کو اپنے ایک مکتوب میں ٹیکسوں کے بارے میں دوسری ہدایات کے ساتھ یہ سنہرا اصول بھی یاد دلاتے ہیں:

''اللہ جل جلالہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی بنا کر بھیجا نہ کہ محصل (Tax Collector) بنا کر''[۱۳]۔

اس سے ثابت ہوا کہ ریاست کا مقصد دین کی دعوت دینا ہے جس کے حصول کے لیے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں، چاہے وہ ٹیکس ہی کیوں نہ ہوں لیکن محض ٹیکس وصول کرنا اسلام کا مقصد کبھی نہیں رہا۔ ٹیکس عائد کرنے کی بنیادی بات یہ ہے کہ اس کا مقصد دین کی دعوت دینا ہو۔

عقلی طور پر قابل قبول اور قابل عمل حقیقت یہی ہے کہ ٹیکس انہی لوگوں پر عائد ہو جو ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ ظاہر بات ہے یہ مالدار، متمول اور اہل ثروت لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ نادار، فقراء اور ظاہری

طور پر سفید پوش طبقہ نہ ٹیکس دینے کا اہل ہے اور نہ ان پر ٹیکس عائد کرنا درست ہے۔ دولت مند طبقے پر ٹیکس لگاتے وقت یہ اصول سامنے رکھا جاتا ہے کہ جو کچھ ان کی ضرورت سے زائد ہو اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ قرآن کریم میں آتا ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرۃ، ۲:۲۱۹)

اور وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجئے جو تمہاری ضرورت سے بچ رہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی ضروریات کی حد پر ٹیکس عائد کرنا اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ اگر ٹیکس عائد کرنا ضروری ہو جائے تو متمول طبقے کی زائد از ضرورت دولت پر عائد کیا جائے۔ ثابت ہوا کہ ضروریات زندگی پر ٹیکس عائد کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔

آج کل ٹیکسوں کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بلاواسطہ ٹیکس اور بالواسطہ ٹیکس۔

ا۔ بلاواسطہ ٹیکس

اوّل الذکر ٹیکس وہ ہیں جو افراد کی دولت، جائیداد اور آمدنی ایک خاص شرح سے بڑھ جانے پر انکم ٹیکس عائد کر دیا جاتا ہے۔ یہی ٹیکس تنخواہ دار افراد کے لیے بھی ہے۔ کاروبار کی مختلف شکلوں پر بھی یہ ٹیکس کس نہ کسی طرح نافذ ہے۔ جائیداد، مکانات اور دکانوں کی ملکیت پر بھی یہ ٹیکس عائد ہوتا ہے۔ یہ وہی ٹیکس ہے جسے قرآن زائد از ضرورت دولت قرار دیتا ہے۔ اس کے جواز میں کسی کلام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم تنخواہ دار طبقے کے معاملے میں صرف آمدنی پیش نظر رکھنا کافی نہیں بلکہ ان کی بنیادی ضروریات پوری ہونے کا تعین ہو جائے تو یہ ٹیکس عائد ہو سکتا ہے۔

ب۔ بالواسطہ ٹیکس

دوسری قسم بالواسطہ ٹیکسوں کی ہے۔ یہ ٹیکس روز مرہ استعمال کی اشیاء مثلاً پیٹرول، کھانے پینے کی اشیاء، گاڑیوں، ہوٹل کے کمروں، ریستوران میں کھانے کے بلوں، بجلی، گیس، فون کے بلوں، صنعتی اشیاء اور لا تعداد دوسری اشیاء پر عائد ہوتا ہے۔ یہ ٹیکس بلا تخصیص امیر غریب سب کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ ٹیکسوں کی اس قسم کو شرعی نقطہ نظر سے مزید دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(ا) اشیائے ضرورت پر ٹیکس

یہ وہ اشیاء ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں۔ جیسے اشیائے خوردو نوش، سواری، دوران سفر دوسرے

شہروں میں متوازن طرز زندگی کے حامل ہوٹلوں میں ٹھہرنا اور کھانے پینے کی اشیاء ریستوران سے خریدنا، سب اس میں شامل ہے۔ اس قسم کی اشیاء پر ٹیکس عائد کرنے کی بظاہر ضرورت محسوس نہیں ہوتی تاوقتیکہ ان اشیاء کی تیاری اور صارف تک پہنچانے کے عمل میں حکومت کو کچھ صرف کرنا پڑے۔

(ب) زائد از ضرورت اشیاء پر ٹیکس

اعلیٰ قسم کے ریستوران میں کھانا، پرتکلف ہوٹلوں میں قیام، گھروں میں ان اشیاء کا استعمال جو ایک عام انسان کی ضرورت کی نہیں ہیں جیسے ائرکنڈیشنر، کافی، چاکلیٹ، رنگارنگ کھانے تیار کرنے کے درآمدی لوازم، یہ سب زائد از ضرورت اشیاء کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان پر ٹیکس عائد کرنا شریعت کی روح کے عین مطابق ہے کیونکہ یہ اشیاء تعیّشات کی تعریف میں آتی ہیں اور جو فرد یا طبقہ ان کا متحمل ہو سکے اسے ٹیکس بھی لازماً دینا چاہیے تاکہ دولت کے بہاؤ (گردش) کو اوپر کے طبقے سے نچلے طبقے کی طرف لایا جائے۔ ٹیکس کے بارے میں اسلام کا یہی اوّلین اصول ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے

اس باب میں اسلامی ریاست کے ذرائع آمدنی کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تفصیل جاننے کے خواہش مند حضرات مندرجہ کتب کا مطالعہ کر سکتے ہیں:

۱۔ کتاب الخراج، امام ابو یوسف، اردو ترجمہ، اسلام کا نظام محاصل، مترجم محمد نجات اللہ صدیقی، مطبوعہ کراچی

۲۔ فقہ الزکوٰۃ، علامہ یوسف قرضاوی، ترجمہ، لاہور۔

۳۔ اسلام کے معاشی نظریے، اول دوم، یوسف الدین، کراچی۔

۴۔ معاشیات اسلام، سید ابو الاعلیٰ مودودی، لاہور۔

۵۔ کتاب الاموال، ابو عبید قاسم بن سلام، ترجمہ، عبد الرحمٰن ظاہر سورتی، اسلام آباد۔

۶۔ اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، لاہور۔

۷۔ اسلام کا نظریہ ملکیت، ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، لاہور۔

اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ٹیکسوں کے نظام میں توازن و عدم توازن اور نتائج کا مطالعہ کرنے کے لیے ''مقدمہ ابن خلدون''، ترجمہ مولانا سعد حسن خاں یوسفی، کراچی دیکھا جا سکتا ہے۔
۲۔ مقاصد شریعت پانچ ہیں: دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسب کی حفاظت، مال کی حفاظت اور عقل کی حفاظت۔ ان کے حصول کی خاطر اللہ حکیم نے انسانوں کے لیے شریعت بھیجی۔
۳۔ المفردات فی غریب القرآن، امام راغب اصفہانی، کتاب الفاء
۴۔ تفصیل کے لیے دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۵، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ملاحظہ کیجئے۔
۵۔ کتاب الاموال، ابو عبید القاسم بن سلام، ترجمہ عبد الرحمٰن طاہر سورتی، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۸۶ء ص ۱۵
۶۔ صحیح بخاری کتاب، الزکوٰۃ
۷۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان
۸۔ زکوٰۃ کے عبادت ہونے کے لیے یہ ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے معاملہ میں اسلام کے پیش نظر شخص ہے، اس کا مال نہیں ہے۔
۹۔ الحج۔ ۳۶
۱۰۔ متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ شریف، کتاب النکاح، باب الولیمہ
۱۱۔ ابو داؤد، کتاب النکاح
۱۲۔ تفصیل کے لیے دیکھئے کتاب الاموال، حوالہ ایضا۔
۱۳۔ کتاب الخراج، امام ابو یوسف، (اسلام کا نظام محاصل، ترجمہ محمد نجات اللہ صدیقی، کراچی، مکتبہ چراغ راہ، ۱۹۶۶ء ص ۳۹۹

مصادر و مراجع

۱۔ ابو داؤد: سلیمان بن الاشعث السجستانی (۲۷۵ھ) ''السنن'' استنبول، دارالدعوۃ، ۱۴۰۱ھ
۲۔ ابو عبید: قاسم بن سلام (۲۲۴ھ) ''کتاب الاموال'' (ترجمہ، عبد الرحمٰن طاہر سورتی، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی ۱۹۸۶ء)

۳۔ ابو یوسف: یعقوب بن ابراہیم (۱۸۲ھ) ''کتاب الخراج'' (ترجمہ، اسلام کا نظام محاصل، محمد نجات اللہ صدیقی، کراچی، مکتبہ چراغ راہ، ۱۹۶۶ء)

۴۔ اصفہانی: حسین بن محمد راغب الاصفہانی (۵۰۲ھ) ''المفردات فی غریب القرآن'' کراچی، نور محمد کاخانہ کتب۔

۵۔ بخاری: محمد اسماعیل بن ابراہیم (۲۵۶ھ) ''الجامع الصحیح ''استنبول، دارالطباعتہ العامرہ۔

۶۔ پنجاب یونیورسٹی: ''دائرہ معارف اسلامیہ'' لاہور جلد ۱۵۔

۷۔ خطیب عمری: ولی الدین محمد بن عبد اللہ (۷۴۳ھ) ''مشکوٰۃ المصابیح'' لاہور، مکتبہ رحمانیہ

''مطالعہ اسلامی قانون'' کے مطبوعہ مضامین

ابتدائی کورس		اختصاصی مطالعہ: اصول فقہ کورس	
۱۔	اسلامی قانون کے ماخذ، ماخذ اوّل۔قرآن	۱۔	علم اصولِ فقہ: ایک تعارف (حصہ اوّل)
۲۔	اسلامی قانون کے ماخذ، ماخذ دوم۔سنت	۲۔	علم اصولِ فقہ: ایک تعارف (حصہ دوم)
۳۔	اسلامی قانون کے ماخذ، ماخذ سوم۔اجماع	۳۔	قرآن
۴۔	اسلامی قانون کے ماخذ، ماخذ چہارم۔قیاس	۴۔	سنت
۵۔	اجتہاد کی تعریف	۵۔	سنّت کی حجیت کا جائزہ
۶۔	اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار	۶۔	اجماع
۷۔	دینی مسائل میں اختلافات، اسباب اور ان کا حل	۷۔	قیاس
۸۔	اسلام کا قانون نکاح وطلاق	۸۔	شرائع سابقہ۔اقوالِ صحابہؓ۔استصلاح
۹۔	اسلام کا قانون وراثت ووصیت	۹۔	استحسان۔استصحاب۔استدلال
۱۰۔	اسلام میں عورت کی استثنائی حیثیت اور اس کی وجوہ	۱۰۔	عُرف اور سدّ ذرائع
۱۱۔	اسلام کا تصور ملکیت ومال	۱۱۔	حکمِ شرعی۔۱ (حکمِ تکلیفی)
۱۲۔	اسلام کا تصور معاہدہ	۱۲۔	حکمِ شرعی۔۲ (حکمِ وضعی)
۱۳۔	اسلام میں شراکتی کاروبار کا تصور	۱۳۔	خاص
۱۴۔	مزارعت اور مساقات	۱۴۔	عام۔مشترک۔حقیقت ومجاز۔صریح وکنایہ
۱۵۔	اسلام کا نظام محاصل	۱۵۔	دلالات
۱۶۔	اسلام کا نظام مصارف	۱۶۔	اسلام کا نظریۂ اجتہاد
۱۷۔	اسلام میں عدل وقضاء کا تصور	۱۷۔	مناہج واسالیبِ اجتہاد
۱۸۔	اسلام کا نظام احتساب	۱۸۔	تقنین (اسلامی احکام کی ضابطہ بندی)
۱۹۔	اسلامی نظام عدل وقضاء میں شہادت کا تصور	۱۹۔	پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کا عمل
۲۰۔	اسلام کا تصور جرم وسزا	۲۰۔	فقہ حنفی وفقہ مالکی
۲۱۔	اسلام کا فوجداری قانون	۲۱۔	فقہ شافعی وفقہ حنبلی
۲۲۔	اسلام کا دستوری قانون	۲۲۔	فقہ جعفری وفقہ ظاہری
۲۳۔	اسلام کا قانون بین الممالک	۲۳۔	قواعد کلّیہ (حصہ اوّل)
۲۴۔	اسلام میں ربا کی حرمت اور بلاسود سرمایہ کاری	۲۴۔	قواعد کلّیہ (حصہ دوم)